ڈاکٹر نثار احمد

مخالفتِ قریش

نوعیت، اسباب، احوال، تاریخ

﴿۳﴾

۲۔ نظریاتی وفکری اختلاف

حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ، ایک دین (یعنی اسلام) کے ساتھ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جس کا مقصد و مدعا بالآخر یہ تھا کہ اسے دوسرے تمام ادیان و مذاہبِ باطلہ پر غالب کر کے انسانوں کی پوری زندگی میں تبدیلی لاکر اللہ کی بندگی پر مجتمع کر دیا جائے۔ (۱) اس غرض سے دعوت وتبلیغ اسلام میں ایک خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس کا پہلا مرحلہ (جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں) تلقینِ عقائد و ایمانیات پر مبنی تھا۔ اور عقائد و ایمانیات میں اولیت اعلان و اقرارِ توحید و رسالت کو حاصل تھی۔ جو محض ایک جملے یا چند الفاظ پر مشتمل تھا یعنی کلمۂ طیبہ:

لا الٰہ الّا اللّٰہ مُحمَّدٌ رَسُول اللّٰہ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے سچے فرستادہ نبی اور رسول ہیں۔

دوسرے عقائد اور کلمات اس کی شرح و بسط، تعیین و تفصیل اور تحدید و تنقیہ کرتے ہیں۔ (۲) یہی دین اسلام کی اصل، فکری بنیاد اور نظریاتی اساس ہے۔ جس پر بعد میں دعوتی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی پورا نظام بتدریج متشکل ہوتا چلا گیا۔ مختصر یہ کہ کلمۂ توحید پورے دین کو حصار میں لئے ہوئے ہے۔ یہی اسلام کی پہچان، دین کا خلاصہ، اور تعارف ہے۔ چنانچہ ابتدائے دعوت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطبین سے **قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا** (۳) ''صرف لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو فلاح پا جاؤ گے'' فرمانا دینِ اسلام کا مختصر ترین بیان مگر جامع دعوتی اشارہ و اعلان تھا۔

اس ایک کلمہ توحید پر دین اسلام کی طرف بلانے اور دعوت وتبلیغ کا مطلب تھا وہاں رائج دین و ملت جاہلیہ سے براہِ راست ٹکراؤ، اور مروجہ دین وملت جاہلیہ کا مطلب تھا، اہل جاہلیت کے آباؤ اجداد کے

دین، اُمت (۴) مذہبی، معاشرتی رسوم، توہمات، اور تقدس مآب مشرکانہ خرافات کے لئے کھلا چیلنج۔ آباو اجداد سے فطری محبت اور مودت، جذباتیت، حسنِ ظن اور اُن کی چیزوں کو نہ چھیڑنے اور جوں کا توں رکھنے کی خواہش تو تھی ہی نیز آباواجداد کا جو ترکہ رسوم ورواج کی شکل میں ملا تھا، اُس کو وہ اپنی ہدایت و ضرورت کے لئے کافی ووافی سمجھتے تھے قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا ط (۵) اس حقیقت کے باوجود کہ اُن کے بزرگ اصلاً نہ کچھ جانتے تھے نہ ہدایت یافتہ تھے۔ (۶) وہ پھر بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے آرزومند تھے۔ (۷) وہ کہتے تھے کہ ہمارے باپ دادا جس دین وملت پر تھے ہم اُس کی اقتدا کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ (۸) اور وہ جس اُمت کے پیروکار تھے ہم بھی اُن کے پیچھے چلتے ہیں اور (آئندہ بھی) چلتے چلے جائیں گے۔ (۹) بت پرستی بھی تو ان گزرے ہوئے (آباواجداد) کا شیوہ تھا اس لئے ہم بھی کرتے ہیں۔ وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ○ (۱۰) کاروبارِ شرک پر بھی انہیں کوئی شرمندگی نہیں تھی بلکہ ناز تھا کہ یہ ورثہ بھی اپنے پُرکھوں سے پایا ہے۔ اس کے لئے کٹ حجتی پر آمادہ اور دلیل یہ دیتے کہ ''یہ بھی اللہ کی ہی مرضی ہے (کہ ہم شرک کا ارتکاب کرتے رہیں ورنہ) اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا'' سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَا اٰبَآؤُنَا (۱۱) قرآن کے مطابق یہ جسارتیں، محض خام خیالی اور اٹکل پچو باتیں تھیں جو وہ مستحقِ عذاب بننے کے لئے کرتے تھے۔ (۱۲)

محض ایک کلمے کی دعوت پر کفار ومشرکینِ جاہلیہ کا بھڑکنا، چراغ پا ہونا اور پھر شدید مخالفت پر اُتر آنا (جبکہ عبادات، معاملات، اخلاقیات میں سے کوئی مطالبہ نہ کیا گیا تھا) ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس کا مطلب خوب سمجھتے تھے، دعوتِ کلمہ کا مطلب محض کلمۂ توحید کی عربی عبارت کی ادائیگی اور ان حروف وکلمات کو منہ زبانی پڑھ دینا ہی نہ تھا کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی تھی اُن کے لئے کلمے کے الفاظ کو دُہرا دینا مشکل نہ تھا۔ اصل میں الفاظِ کلمے کے بین السطور جو مفہوم پایا جاتا تھا اور الفاظ کے نتیجے میں جو تقاضا عملی صورت میں سامنے آتا تھا، وہ انہیں بھی صاف نظر آتا تھا چنانچہ یہ حوالہ ابن ہشام کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے کہ ایک مرتبہ سردارانِ قریش، جناب ابوطالب کے پاس پہنچے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شکوہ شکایت پیش کی۔ جناب ابوطالب نے ازراہِ تواضع حضور ﷺ سے فرمایا کہ یہ اشراف قوم تم سے کچھ صلح صفائی کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ سرداروں کی باتیں ختم ہوگئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا دیکھو! میں تمہیں ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں کہ اگر تم اس کا اقرار کرلو تو سارے عرب پر تم فرماں روا بن جاؤ گے اور تمام عجم تمہارے زیرنگیں ہوجائے گا۔ (۱۳) اس پر ابوجہل نے بہت

خوش ہوکر سننے پر آمادگی ظاہر کی لیکن جب آنحضور ﷺ نے اُن سے فرمایا قولو لا الہ الا اللہ "تو پھر لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلو" تو وہ لوگ غیض وغضب کے عالم میں اپنے کپڑے سمیٹتے پیر پٹختے چلے گئے۔(۱۴) کفار ومشرکین کے اس ردعمل کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ کلمۂ توحید محض چند الفاظ نہیں تھے اس میں پنہاں وہ پیغام تھا جو پوری زندگی کو بدلنے پر مجبور کرتا تھا۔ تمام معبودانِ باطل کی نفی، مشرکانہ رسوم سے اجتناب، ایک اَن دیکھے خدا کو تمام عقیدتوں ومحبتوں کا مرکز ومحور بنانا اور اُس کے فرستادہ رسول کی مکمل اطاعت، آسان اور خرافات سے پاک دین، سیدھا راستہ انہیں کس طرح پسند آسکتا تھا۔ اس لئے وہ دین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامنے پیش کیا وہ اُس دین، طور طریقے، رسم ورواج اور طرزِ زندگی سے مختلف تھا جو اُنہوں نے اپنے آباواجداد سے ورثے میں پایا تھا، خاص طور پر اُن کی وہ روزمرہ زندگی جو کفر وشرک بت پرستی سے آلودہ تھی۔ اس لئے قریش کا آمادہ بہ مخالفت ہونا صاف ظاہر تھا۔

چنانچہ مولانا شبلی رحمہ اللہ نے اسبابِ مخالفتِ قریش کا پہلا سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "ناتربیت یافتہ اور تند خو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو اُن کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف ہو، اُن کو سخت برہم کردیتی ہے۔ اس کے ساتھ اُن کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور اُن کی تشنگیٔ انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز نہیں بجھا سکتی تھی"۔(۱۵) وہ آگے لکھتے ہیں "عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا۔ خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر وشر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجودِ معطل تھا"۔(۱۶)

۳۔ اثر واقتدار، مفادات کو خطرہ

اس بات کا مشاہدہ عام انسانی فطرت کے مطابق روزمرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے کہ آدمی ہر اُس چیز کے مخالف ہوجاتا ہے جس سے اُس کے مفادات کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو۔ قریش کی جانب سے مخالفت کا ایک بہت بڑا جواز یہ خطرہ تھا کہ ظہور پذیر ہونے والا دین، اسلام اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کی جانے والی دعوت کے نتیجے میں اُن کے اثر واقتدار اور مفادات پر براہِ راست ضرب پڑ رہی تھی۔ مولانا شبلیؒ نے بھی اسبابِ مخالفتِ قریش میں اسے دوسرا سبب قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "اسلام کی وجہ سے قریش کی عظمت واقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا اس لئے قریش نے شدت سے

مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اُسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے''۔(۱۷) اسی سبب کو مولانا مودودیؒ نے قریش کی مخالفت کی بڑی اور بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔(۱۸)

قریش کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی مفادات گوناگوں تھے۔ اور مختلف پہلوؤں سے پورے جزیرہ نمائے عرب میں قریش کی حیثیت، مقام و مرتبہ سب سے بلند و برتر اور اثر و رسوخ لامحدود تھا۔ اس امر کی وضاحت اور تفصیلات مولانا شبلیؒ کے ہاں کئی صفحات میں پائی جاتی ہیں۔(۱۹) اس ضمن میں چند حقائق تاریخی صداقت کے ساتھ بہت اہم اور نمایاں ہیں۔ مثلاً

۱۔ پورے عرب میں قریش کو جو عزت، قدر و منزلت حاصل تھی وہ خانۂ کعبہ کی وجہ سے تھی۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر صدیوں پہلے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں بیت اللہ اور مرکزِ توحید کی حیثیت سے ہوئی تھی جس کے قصد و زیارت (حج) کی منادی بھی کرادی گئی تھی تاکہ پوری دنیا کے لوگ اللہ کے گھر کی زیارت اور حج کے لئے خانۂ کعبہ میں آئیں۔(۲۰) لیکن حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے بعد صدیوں کے عمل دخل سے کعبۃ اللہ کی حیثیت اس وقت (ظہور اسلام) محض ایک بت خانے کی ہوگئی تھی اور جیسا کہ مشہور ہے بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت وہاں ۳۶۰ بتوں کا راج تھا۔ چنانچہ اُس وقت قریش خانۂ کعبہ کے متولی اور مہتمم تھے اس لئے بقول مولانا شبلیؒ ''قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایگانِ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کعبے کے مجاور اور کلید بردار تھے۔(۲۱)

۲۔ اجدادِ قریش میں سے ۴۴۰ء میں قصی بن کلاب نے جو شہری مملکت مکہ قائم کی تھی، اور انتظام و انصرام کے لئے مختلف مناصب قائم کر کے اولاد میں تقسیم کر دیئے تھے اُن میں سے متعدد مناصب متوارث چلے آ رہے تھے۔(۲۲) یہ بجائے خود منفعت بخش عہدے تھے، نیز متعدد شعبے مختلف النوع مالیاتی فوائد بہم پہنچا رہے تھے۔ بتوں پر نذر و نیاز، چڑھاوے، قربانیاں، الگ آمدنی کا ذریعہ تھی۔

۳۔ قریشی تاجر مقامی اور بین الاقوامی تجارت میں صدیوں سے مشغول تھے۔ اُن کی تجارتی ترقی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ مکۂ معظمہ اس راستے پر واقع تھا جہاں سے شمال اور جنوب دونوں طرف تجارتی قافلے اور کاروان آتے جاتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں تجارتی تعلقات اور معاہدات قریش نے ساری دنیا میں قائم کر رکھے تھے۔ اس لئے ان کا اثر و رسوخ تمام اطراف میں یکساں قائم تھا۔

۴۔ خانۂ کعبہ اور حج کی برکت سے سال میں چار مہینے (اشہرِ حرم) ایسے مشہور و متداول چلے

آرہے تھے کہ جس میں جنگ وجدال حرام تھا اور انتہائی بدامنی کے ماحول میں امن وامان کا مؤثر انتظام خانۂ کعبہ کی وجہ سے قائم تھا۔ امن وامان کا قیام اور پرتعیش زندگی اہل مکہ کے روزمرہ میں داخل تھی۔ اور یہ سب کچھ خانۂ کعبہ کی برکت تھی اُن کی کوششوں کا اس میں دخل نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ قریش کو اپنے باپ دادا کے زمانے سے سارے عرب میں جو قدر ومنزلت، مذہبی مرکزی حیثیت، اقتدار، شہرت وعالمگیریت، مالی فوائد، معاشرتی اہمیت، تجارتی بین الاقوامی تعلقات کی برکت اور ساری دنیا میں بت پرستی کے سب سے بڑے مرکز یعنی خانۂ کعبہ کے مجاور ومہتمم اور نگراں ہونے کی حیثیت سے جو عزت وشہرت حاصل تھی اُن سب کا اصل حوالہ خانۂ کعبہ تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ نئی اُبھرنے والی قوت، نیا دین اسلام، اور توحید کی دعوت نے سخت خطرات پیدا کردیئے ہیں اور بادی النظر میں نبوی دعوت وتحریک ان کے اثر واقتدار اور مختلف النوع مفادات پر براہِ راست ضرب لگا رہی ہے۔ ایک کلمے کی دعوت کا مطلب ہے ایک الٰہ اور صرف ایک معبود۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہمارے تو اتنے بہت سے معبود، الٰہ، بت، دیوتا و دیویاں ہیں۔ ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر، سب کو فراموش کر کے محض ایک کی پرستش پر اکتفا کرنا کس قدر عجیب بات ہے (اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ O) (۲۳) اس صورت میں تو ہمیں بت پرستی چھوڑنا ہوگی، اور خانۂ کعبہ جہاں ہبل نصب ہے، اور اساف اور نائلہ اور خداؤں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اس کی زیارت کے لئے تو ساری دنیا سے لوگ آتے ہیں، اسی سے بت خانے کی رونق ہے، لوگوں کی آمد ورفت، ہماری عزت، ہماری آمدنی، تجارت، ضروریات کی تکمیل، ہمارا انتظام وانصرام، مذہبی پیشوائی، مقام ومرتبہ، اثر ورسوخ سب کچھ اس گھر سے وابستہ ہے، اگر ہم اس سے ہی کنارہ کش ہوگئے تو ہمارا نقصان ہی نقصان ہوگا۔ ہم تو بے یارومددگار رہ جائیں گے، سارا عرب ہمارا دشمن ہوجائے گا، کیا ایک اللہ کو ماننے کی خاطر ہم اپنے آپ کو تباہ کرلیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، ہمیں ایسی دعوت کو روکنا ہوگا ورنہ ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ قریش کے سامنے یہ تمام اندیشے، خطرات اور بھیانک مستقبل تھا جس کا خلاصہ قرآن نے اپنے کلام بلاغتِ نظام میں محض ایک جملے میں نقل کردیا:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰی مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ (۲۴)

اور لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہوکر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے جائیں۔

قریش کے یہ تمام اندیشہ ہائے دور دراز، دراصل اُن کی ذہنی اختراع تھے، ورنہ تاریخی اور

واقعاتی اعتبار سے اگر وہ غور وفکر کرتے تو اُنہیں معلوم ہوجاتا کہ خانۂ کعبہ اور اس سے متعلق تمام فوائد و ثمرات قریش اور اہلِ مکہ کو خانۂ کعبہ کے مرکزِ خدا پرستی ہونے کی حیثیت میں حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ قریش کا اندیشوں سے بھرپور قول نقل کرنے کے بعد قرآن میں تاریخی حوالوں سے ان کے قول کی تردید میں بیت اللہ کی برکات وثمرات کو واضح کیا گیا ہے اور ایک طرح سے اُن کے اندیشوں کا جواب بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص کی اگلی آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کا یہ گھر اللہ کے بندے اور رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر تعمیر کیا اور منادی کردی کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے اس گھر کی طرف آؤ اور اس کا طواف کرو۔ یہ گھر صدیوں سے عرب کا مرکز بنا چلا آرہا ہے۔ ہر سال ہزاروں انسان نہ صرف عرب سے بلکہ پوری دنیا سے کھنچے چلے آتے ہیں، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسر ہے، اور ہر شخص اس گھر کو اور اس گھر کے رکھوالوں کی حیثیت سے قریش کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی نعمت کا ثمرہ ہے کہ تم (قریش) عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دنیا بھر سے مالِ تجارت اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں چلا آرہا ہے اور دنیا کی تجارت سے تم متمتع ہو رہے ہو۔ تو کیا اس کو امن ومرکزیت کا مقام تمہاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے اُس سے منحرف اور باغی ہوکر تم پھلو پھولو گے مگر اُس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہوجاؤ گے؟ حالانکہ اگر تم تاریخ سے سبق لو تو دیکھو گے کہ جس مال و دولت اور خوش حالی پر تم اترا رہے ہو اور جس کے چھن جانے کے خطرے سے تم اللہ کے دین اور رسول کی دعوت سے منہ موڑنا چاہتے ہو، تو یہی چیز کبھی عاد، ثمود، سبا، مدین اور قومِ لوط کے لوگوں کو بھی حاصل تھی، لیکن اللہ کے دین اور رسول کی دعوت ٹھکرا کر وہ تباہ وبرباد ہوگئے۔ کیا وہی رویہ اختیار کرکے تمہاری شامت نہیں آسکتی؟ (وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (۲۵) لیکن پچھلی قوموں کو تباہ کرنے سے پہلے اللہ نے اُن کی ہدایت اور کج روی سے بچانے کے لئے اپنا رسول بھیجا جس طرح اب تمہارے پاس ایک رسول تمہیں تمہارے رویے پر متنبہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اُس رسول کو ٹھکرانے اور کفر وانکار کی روش اختیار کرکے تم اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو، جس سے تمہارا عیش اور خوش حالی بھی باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اُس رسول کی دعوت کو رد کرکے ظالم نہ بنو ورنہ نہ تم باقی رہو گے اور نہ تمہاری خوش حالی (وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ (۲۶) دنیا کی یہ زندگی اس کا

ساز وسامان، عیش وآرام، زیب وزینت بہر حال چند روزہ اور عارضی ہے۔ اس لئے چند روزہ عیش کے لئے آئندہ ہمیشہ کی زندگی میں راحت وآرام کو ٹھکرانا کون سی عقل مندی ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان اس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو محروم کرلے، اصل یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی (وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۷)

۴۔ معاشرتی اخلاقی برائیوں پر گرفت

مولانا شبلیؒ کے نزدیک اسبابِ مخالفتِ قریش میں سے ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے۔ ابولہب جو خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اُس نے حرمِ محترم کے خزانے سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا، اخنس ابنِ شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے اعمالِ شنیعہ میں گرفتار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت داروگیر کرتے تھے جس سے اُن کی عظمت واقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی۔ (۲۸) اس کے بعد تفصیل میں قرآنی آیات کو بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ (۲۹)

جاہلیت عرب کے مکی معاشرے میں مولانا شبلیؒ کے بقول بڑے بڑے اربابِ اقتدار کا نہایت ذلیل بداخلاقیوں میں مبتلا ہونا اور پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمربستہ ہونا قابلِ فہم ہے۔ کیونکہ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے کہ آدمی اپنے اوپر دوسرے کی تنقید آسانی سے برداشت نہیں کرتا، خصوصاً ایسی برائیوں کی پردہ داری جو وہ دوسروں سے چھپا کر کرتا ہے اور اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسروں کے سامنے اس کا راز افشا نہ ہونے پائے لیکن وہ اگر طشت از بام ہوجائے، تو اس کا چراغ پا ہونا اور مخالفت میں سب کچھ کر گزرنا گویا اُس کی فطرت کا تقاضا ہوگا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُس وقت کا جاہلی معاشرہ اخلاقی قدروں سے بے بہرہ نہ تھا۔ تمام تر بداخلاقیوں کے باوجود اس کے باشندوں میں وہ اخلاقی حس موجود تھی جو اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی اور خیر وشر کے درمیان فرق وامتیاز کا ادراک کرسکے اور رذائل اخلاق اور فضائلِ اخلاق کا شمار کرسکے۔ یہ اخلاقی شعور عوام الناس میں بھی تھا اور اربابِ اقتدار

میں بھی۔ اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عوام الناس کے سامنے قرآن کی وہ آیات تلاوت فرماتے، جن میں انتہائی شائستگی سے محض اشاروں کنایوں میں کسی کے شخصی عیوب، اخلاقی دیوالیہ پن اور خبثِ باطن کا ذکر ہوتا، اور کمالِ حیا یہ کہ اُس کا نام نہ لیا جاتا، تب بھی لوگ فوراً پہچان جاتے اور الفاظ، انداز، عبارت سے بننے والی تصویر کو فوراً شناخت کر لیتے اور سمجھ جاتے کہ اس کے پیچھے کون ہے۔ چنانچہ مثلاً جب قرآن نے نام لئے بغیر ایک ایسے شخص کی طرف اشارہ کیا کہ ''ایک ایسا شخص ہے جو پیغمبر خدا کو نماز پڑھنے سے روکنا چاہتا ہے، جو حق کو جھٹلاتا، اُس سے منہ موڑتا ہے، سرکش ہے، اپنے حمایتیوں پر بڑا نازاں ہے، وہ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو وہ اللہ کے انتقام سے بچ نہیں سکے گا''۔ (۳۰) تو مخاطبین کے لئے ابوجہل کو پہچاننا مشکل نہ رہا۔ اس طرح ابتدائی دور کی سورۃ المدثر میں (۳۱) میں مکی اشرافیہ کے جس رکن کی دولت مندی، اولاد کی کثرت وقوت، طمع وحسد، اور غرور وتکبر کا حوالہ دیا گیا اور بتایا گیا کہ وہ آیاتِ الٰہی سے انکار کرنے والا، اُسے سحر وفسوں قرار دینے والا اور انسانی کلام سے زیادہ وقعت نہ دینے والا ہے تو لوگوں کو ولید بن مغیرہ کی شناخت میں ذرا مشکل پیش نہ آئی۔ سورۃ القلم میں بھی (۳۲) ولید بن مغیرہ کا نام لئے بغیر جو تعارف کرایا گیا جھٹلانے والا، جھوٹی قسمیں کھانے والا، طعنے دینے والا، چغل خور، نیکی کے کاموں سے روکنے والا، حد سے بڑھا ہوا، سرکش، گناہ گار، اُجڈ، بدنام، بدذات، اولاد ومال پر غرور والا اور آیاتِ قرآنی کو پچھلے زمانے کے قصے کہانیاں قرار دینے والا تو کسی کو پہچاننے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ ولید بن مغیرہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

بہرحال مکی معاشرے میں پائی جانے والی برائیاں جن کی قرآن میں مذمت کی گئی اور نزولِ قرآن کے دوران وقتاً فوقتاً مکی سورتوں کا حصہ بنتی رہیں (۳۳) اور جنہیں بعض اوقات مدنی سورتوں میں بھی بہ تکرار نمایاں کیا گیا ان کے ساتھ ہی ساتھ نمایاں اخلاقی خوبیوں، صفات وکمالات کو بھی بیان کیا گیا، نیز اُن کا حکم اور ترغیب دی گئی تاکہ کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہوجائے، اور دیکھنے والے چشم سر سے دیکھ لیں کہ اخلاقِ رذیلہ کی بہتات کن لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اخلاقِ عالیہ وفاضلہ سے کون کون متصف ہے۔ (۳۴) یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُس وقت کے ماحول میں سماجی، اخلاقی برائیوں پر گرفت براہِ راست اور سختی کے ساتھ نہیں کی گئی بلکہ عمومی انداز میں، نرمی، شائستگی اور شفقت کے ساتھ آئینہ دکھایا گیا کہ خود ہی شرمندہ ہوکر سوچیں، سمجھیں اور اپنا رویہ بدلیں اور دیکھ لیں کہ جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے وہ کون ہے اور بے داغ سیرت وکردار میں جو بے مثل ہے وہی خلقِ عظیم پر فائز ہے، (۳۵) وہی داعی الی الحق

ہے، وہ صادق وامین ہر طرح سے قابلِ اعتبار ہے تو اُس کی دعوت قبول کرنے میں کیا حرج، کیا عذر ہے۔ پھر جب اُس داعی الی الحق نے زبانِ وحی ترجمان سے خود فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳۶)

میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں بھلا تم سمجھتے نہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی یہ اعلان بھی کروایا گیا:

أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّي إِلَّا أَن يُهْدَىٰ ۖ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ (۳۷)

بھلا جو حق کا راستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے یا وہ کہ جب تک کوئی اُسے راستہ نہ بتائے رستہ نہ پائے۔ تو تم کو کیا ہوا ہے؟ کیسا انصاف کرتے ہو۔

چنانچہ جب اُنہوں نے تعقل وتفکر سے کام لیا تو عوام الناس میں سے ایسے کچھ نہ کچھ نکل ہی آئے جنہوں نے دامنِ مصطفوی ﷺ سے وابستگی کو ترجیح دی۔ لیکن قوم میں اکڑی گردن والے سرداروں، رؤسا اور اخلاقِ رذیلہ کے حامل زور آوروں نے وحیٔ الٰہی کے ذریعے سماجی اخلاقی برائیوں کی پردہ دری کو اپنی ذاتی توہین خیال کیا، اس لئے دعوت اور داعی دونوں کے سخت خلاف ہو گئے۔

۵۔ خاندان اور نظامِ معاشرت کی شکستگی و پامالی

عرب میں ہمیشہ سے قومیت و معاشرت کی بنیاد خون اور نسل پر قائم تھی۔ قبیلوں، برادریوں، خاندان، بطون وشعوب کا پھیلاؤ، اور حسب نسب کی توقیر خون پر اور نسل پر قائم تھی اور وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی معاشرہ، خون، نسل، رنگ، زبان و وطن کے علاوہ کسی مذہب اور نظریے پر بھی قائم ہو سکتا ہے۔ اسلامی دعوت کے نتیجے میں ان کا معاشرتی تار و پود بکھر گیا۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا اور رشتے، ناطے، قدریں، جمعیت، عصبیت سب کا لحاظ ختم ہو گیا۔ یہ قریش کے لئے بڑی اذیت ناک صورتِ حالات تھی، وہ شاید سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن یہ معاملہ اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

اب یہ ہوا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل، بطون، خاندانوں اور حلیفوں میں شہرِ مکہ اور اس کے مضافات میں ہر جگہ اہلِ ایمان پیدا ہو گئے، اور دن بہ

دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ (۳۸) اور خاص بات یہ کہ جو شخص ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لیتا اور اقرارِ توحید کر لیتا تو وہ پھر ایسا ہو جاتا کہ اس پر جم کر رہ جاتا، اسے نہ کوئی ترغیب و لالچ جادۂ ایمان سے ہٹا سکتا تھا اور نہ کوئی کڑی سزا و ظلم و ستم اسلام ترک کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ (۳۹) یہ مسئلہ قریشِ مکہ کے ہر خاندان کا، ہر گھر کا مسئلہ تھا۔ کسی کا بیٹا ایمان لے آیا، (۴۰) کسی کے بھتیجے نے کلمہ پڑھ لیا، (۴۱) کسی کے بھائی نے جامِ توحید پی لیا، (۴۲) کسی کی بہن حق آشنا ہو گئی۔ (۴۳) تو کسی کی ماں ایک اللہ کی پرستار بن گئی۔ کسی کا حبشی غلام اَحد، احد کی صدا لگانے لگا، (۴۴) اسی طبقے کا ایک اور صہیب رومی راہِ حق پہ چل نکلا، (۴۵) یہ آئے دن کا قصہ تھا۔ اس مسئلے کے کئی پہلو تھے۔ جو ایمان لایا، وہ اپنے گھر میں اجنبی بن گیا، ماں باپ، بھائی بہن، دوست احباب، سب کے درمیان رہتے ہوئے سب سے الگ، بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ، گالم گلوچ، مار پیٹ بے اثر، ماں کی خوشامد و پیار بے کار، یہ دھمکی بھی کارگر نہ ہو سکی کہ جب تک تو ایمان اسلام نہ چھوڑے گا، میں نہ بال سنواروں گی نہ کھانا کھاؤں گی نہ کپڑے بدلوں گی، مومن بیٹے نے اس کا اثر بھی نہ لیا۔ (۴۶) جو اسلام لایا وہ ''بے دین'' ہو گیا۔ جس نے اپنے باپ دادا کے دین و مذہب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، صابی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ لات و منات کا ایک دشمن پیدا ہو گیا، صنم خانۂ کعبہ کا ایک پجاری چلا گیا۔ سردارانِ قریش میں سے کسی نہ کسی کو ہر روز یہ خبر مل جاتی کہ آج فلاں نے ایمان قبول کر لیا، فلاں فلاں اسلام لے آیا، یہ خبریں اُن کی تشویش میں مسلسل اضافہ کرتی رہتیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ان کا بندوبست کس کس طرح کریں۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دعوتِ محمدیؐ نے ان کی صفوں میں پھوٹ ڈال دی ہے، ان کی جمعیت منتشر کر دی ہے اور ان کی بت پرستانہ یکجہتی کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔

خاکسار کی نظر میں مخالفتِ قریش کا یہ ایک ایسا حقیقی سبب ہے جو اگرچہ مصنفین، مؤرخین اور سیرت نگاروں کی توجہ حاصل نہ کر سکا لیکن اپنی اصلیت و واقعیت میں یہی ایک سبب سب پر بھاری ہے۔ اور سب باتیں تو نظری و فکری اور نفسیاتی ہیں، حقیقی اور عملی سبب یہی ہے کہ اسلام نے اُن کی قومیت، اُن کے معاشرے اور عام سماجی زندگی کو زک پہنچائی تھی جس سے عملاً اُن کا ہر گھر متاثر ہوا۔ باپ بیٹے کا مخالف، چچا بھتیجے کا دشمن، ماموں بھانجے سے ناراض، بھائی بھائی سے نالاں، غلام آقا کا نافرمان، آقا لونڈی سے پریشان، پڑوسی پڑوسی سے متنفر اور زیردست اپنے سردار سے بے قابو ہو گیا، اور یوں ان کا سب کچھ بکھر کر رہ گیا اُن کی روزمرہ زندگی تلخ ہو گئی، ان کے آپس میں پھوٹ پڑ گئی، ان کی جمعیت منتشر ہو گئی۔

اس سبب کی واقعیت و حقیقت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ کفارِ قریش اور سردارانِ مکہ

اپنی دانست میں صورتِ حال کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے اور چالاکی وعیاری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دباؤ ڈالنے کے لئے بار بار حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابوطالب کے پاس بڑے سے بڑا وفد لے کر گئے (۴۷) اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جوالزامات لگائے (۴۸) اُن میں یہ الزام بھی شامل بلکہ نمایاں تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے معاشرے میں پھوٹ ڈال دی ہے اور تفرقہ پیدا کر دیا ہے (۴۹) وہ لوگ یہ الزام بار بار اور مختلف مواقع پر دہراتے رہے یہ الزام تراشی کم از کم پانچ چھ سال تک یعنی اسلام حضرت حمزہؓ سے لے کر جناب ابوطالب کی وفات سے کچھ پہلے تک ضرور کرتے رہے (۵۰) اس تسلسل سے اس الزام کا اعادہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دعوت وتبلیغِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنہیں دوسری کئی باتوں کی طرح اس بات سے بھی بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی کہ رات کی نیند، دن کا چین رخصت ہو گیا تھا۔ اس لئے اسلام کو مٹانے کے لئے مستعد ہو گئے۔

تفرق جماعت کی فکر اور صدمہ تو ظاہر ہے کہ عوام الناس کو اتنا نہ تھا جتنا بالائی طبقے، امرا، روسا اور عیش وعشرت کے دلدادہ سرداروں اور قوم کے بڑوں کو تھا۔ دردِ سر عوام کا نہیں خواص کا تھا۔ کیونکہ ''ایمان'' کسی نہ کسی شکل میں اُن کے اپنے گھرانوں میں پہنچ گیا تھا۔ اولادیں بے قابو ہو گئیں، زیردستوں نے زبردستی دکھانی شروع کر دی تھی۔ یار دوستوں کے حلقوں، چوپالوں میں، رعب داب میں کمی آ گئی اور عملاً مخالفت وعداوت کا بازار اسی طبقے کا پیدا کردہ تھا۔ فخر وغرور، رعونت اور طاقت کا نشہ اسی گروہ کے دماغوں میں تھا۔ پہلے تو وہ سمجھے تھے کہ چند کمزور سر پھرے لونڈی غلام ہیں جن پر ظلم وستم ڈھا کر ان کے دماغ درست کر دیں گے لیکن جب ایمان لانے والوں کی تعداد سینکڑوں میں ہو گئی اور حضرت عمر وحمزہ رضی اللہ عنہم جیسے لوگ بھی ہم نوائے توحید بن گئے تب انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور فکر لاحق ہو گئی۔

۶۔ بت پرستی کی ممانعت ومذمت

مولانا شبلیؒ نے مخالفتِ قریش کا پانچواں سبب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ عرب پر یکساں تھا، یہ تھا کہ جو معبود سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھا اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام اُن کا نام ونشان مٹاتا تھا اور ان کی شان میں کہتا تھا:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ (۵۱)

بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔ (۵۲)

مولانا شبلیؒ قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب کے تحت اگرچہ پہلا سبب یہ بیان کر چکے ہیں کہ ''کوئی تحریک جو اُن کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف ہو، اُن کو سخت برہم کر دیتی ہے''۔ نیز یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ ''عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا''۔ (۵۳) تاہم یہاں بت پرستی کو مخالفت کی سب سے بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے غالباً اول الذکر موقع پر اصل زور آبائی رسم وعقائد پر دیا گیا تھا جس میں بت پرستی بھی شامل تھی جبکہ ثانی الذکر موقع پر بت پرستی کی ہمہ گیریت دکھائی ہے۔ ہم نے اس کی متابعت میں اپنے پہلے سبب کی تفصیل میں قریشِ مکہ کے مجموعی دین و مذہب سے اختلاف کو مطمحِ نظر قرار دیا ہے۔ اور اصل زور اُن کے عقائد ونظریات اور اوہام وخرافات پر اس لئے دیا ہے کہ کسی بھی دین و مذہب کی بنیاد عقائد، نظریات اور تصورات پر ہی ہوتی ہے جبکہ اعمال وعبادات اور عادات واطوار اور معاشرت کے تمام مظاہر ان ہی اساسیات کے نمائندے ہوتے ہیں۔

اسلام کی بنیاد بھی چند عقائد وایمانیات پر ہے جن کو تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اور جب ایک دفعہ ایمان دل ودماغ میں راسخ ہوجائے اور زندگی کا نظریہ بدل جائے تو اس کا اثر لامحالہ تمام عادات واطوار کو بدل دیتا ہے۔ اس طرح تزکیۂ نفس تزکیۂ حیات کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کی تصدیق وتائید تاریخ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ کفار ومشرکینِ مکہ میں سے جو بھی کلمہ پڑھ لیتا تھا اور توحید، رسالت، آخرت کے عقائد وایمانیات سے مرصع ہوجاتا تھا، اُس کی زندگی خود بخود بدل جاتی تھی اور وہ یک لخت آبائی دین و مذہب سے متنفر ہوکر ہر قسم کے شرک وبت پرستی سے باز آجاتا تھا۔ یہ منظر تمام اہالیانِ مکہ بطورِ عام اور کفارِ قریش اور ان کے سردار ورؤسا بطورِ خاص روزانہ مشاہدہ کر رہے تھے اور اُس ابتدائی وقت تک پنج وقتہ نماز کے ساتھ ساتھ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی تعمیل فرض نہیں ہوئی تھی۔

بت پرستی کفارِ قریش کے آبائی دین و مذہب کا جزوِ اعظم تھا۔ اور اس وقت عرب بلکہ پوری دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز خانۂ کعبہ بنا ہوا تھا۔ بت پرستی کی ممانعت اور مذمت مکی سورتوں کا عام مضمون ہے۔ اسی لئے جو الزامات سردارانِ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد کرتے تھے، اُن میں یہ الزام بھی نمایاں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے دین اور معبودوں کو برا بھلا کہتے تھے، اُن کے

عیب نکالتے، گالیاں دیتے تھے۔ (۵۴) مولانا شبلیؒ نے اپنی کتاب میں قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ سورۂ انبیاء کی آیت ۹۸ ہے۔ اس آیت میں بھی بتوں اور بتوں کے پوجنے والوں، دونوں کا انجام بد مذکور ہے۔ کہ دونوں جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ایندھن موضح القرآن کے مطابق آگ تیز کرنے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ اس آیت سے پہلے جو مضامین سورۂ انبیاء میں بیان کئے گئے، اُن کافروں، بت پرستوں کے لئے تازیانۂ عبرت تھے، خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ (۵۵) جو قریشی بتوں، بت پرستوں اور بت خانے پر ہو بہو صادق آتا تھا۔ اس میں اُنہیں وارننگ دی گئی کہ ایسے بتوں کی پرستش سے باز آجائیں جو خود بھی بے جان ہیں اور دوسروں میں بھی جان نہیں ڈال سکتے، جو نہ بولتے ہیں نہ نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں، جو خود اپنی حفاظت پر قادر نہیں، نیز آخرت میں تو ان کا انجام ہے ہی برا۔ یہاں پر دنیا میں بھی اپنے آپ کو نیست و نابود ہونے سے نہیں بچا سکتے۔ چنانچہ قریش نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیا کہ دس، گیارہ سال بعد (۸ ہجری میں) یہ تمام بت بھی تباہ ہوئے اور پورا بت خانہ بھی تباہ و برباد ہو گیا۔

مختصر یہ کہ عملاً اور واقعتاً بتوں کا کفار و مشرکینِ قریش کی زندگیوں سے براہِ راست تعلق تھا۔ اُن کے تمام نجی، قبائلی اور قومی معاملات میں اصل کارفرمائی معبودانِ باطل یعنی بتوں کو حاصل تھی، بتوں کے بغیر وہ یہ تصور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ہمارے روزمرہ کے معاملات ٹھیک رہ سکتے ہیں، زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اس لئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر بتوں کا ہماری زندگی سے عمل دخل ختم ہو گیا تو زندگی بے کیف ہو جائے گی اور اس بے رخی سے ہمارے معبود ہم سے خفا ہو گئے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا، چنانچہ اپنے بتوں کے خلاف وہ کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ دعوتِ اسلامی کے نتیجے میں بت پرستی کے حساس معاملے کو چھیڑنا اُن کی مخالفت مول لینا تھا۔

۷۔ طمع و حسد، بغض، رنجش، ذاتی وجوہ

مولانا شبلیؒ کے نزدیک مخالفتِ قریش کا چوتھا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ اس نکتے کی تفصیل میں حضرت علامہ نے چند باتیں لکھی ہیں۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندانِ بنو اُمیہ اپنے حریف بنو ہاشم کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا تمام لڑائیاں ابوسفیان نے ہی برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیسِ لشکر رہا۔ عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ ﷺ کے دوشِ مبارک پر اُونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اُموی تھا۔ بنوامیہ کے بعد جس قبیلے کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا وہ بنومخزوم تھے۔ ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا اس لئے اس قبیلے نے بھی آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی۔(۵۶)

تاریخی واقعات وحقائق کی روشنی میں افسوس یہ ہے کہ مولانا شبلی علیہ الرحمۃ کا بیان کردہ یہ سبب اور اس کے ضمن میں مذکور ذیلی نکات تاریخی صداقت نہیں رکھتے۔ عہدِ رسالت میں تاریخ دعوت وتبلیغ اسلامی کا جائزہ یہ بنیادی حقیقت سامنے لاتا ہے کہ اسلام کی اشاعت پورے مکی عہدِ ماقبلِ ہجرت میں قبائلی یا خاندانی خطوط پر استوار نہیں ہوئی (۵۷) نیز اسلام دوستی یا اسلام دشمنی میں قبائلی رقابت یا خاندانی عصبیت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ اس امر کی وضاحت کے لئے چند حوالے درج ذیل ہیں:

۱۔ مخالفت کی پہلی آواز اور بدترین دشمنِ خدا، بنو ہاشم کا اہم رکن، جناب ابوطالب کی وفات کے بعد خاندان کا بننے والا سربراہ، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا ابولہب تھا۔ جس کا نام لے کر اللہ نے اُسے دنیا وآخرت میں بدترین انجام کی وعید سورۃ اللہب میں سنائی۔ بادی النظر میں قبائلی عصبیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہرگز نہ کرتا بلکہ جناب ابوطالب کی طرح آپ ﷺ کی مدد وحمایت میں سینہ سپر ہو جاتا لیکن وہ نجی دعوتوں میں بھی آپ کی مخالفت کرتا رہا، کوہِ صفا کے موقع پر خطابِ رسالت مآب ﷺ پر گستاخی کا مرتکب ہوا اور پورے مکی دور میں آنحضور تبلیغ کے لئے جہاں جہاں تشریف لے جاتے تو اطلاع ملتے ہی یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے آپ کی نفی کرتا جاتا۔(۵۸)

۲۔ دعوتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال مکہ مکرمہ اور اُس کے مضافات میں رہنے والے تمام قبائلِ قریش اور غیر قریش، سب نے یکساں طور پر کیا۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مکہ اور حوالی مکہ کے تمام قابلِ ذکر خاندانوں میں اہل ایمان کی کم یا زیادہ، کچھ نہ کچھ تعداد ضرور موجود تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق اور دوسرے مآخذِ سیرت وتاریخ کے علاوہ اُردو کتابوں میں ہی مثلاً اصح السیر میں السابقون الاولون کی فہرست (۵۹)، مولانا مودودیؒ کی کتاب سیرت سرورِ عالم میں تین سال کی خفیہ تبلیغ کے زمانے میں ہونے والے کام اور ایک جدید العہد محقق، ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی کے مقالے (۶۰) میں دی گئی تفصیلات کے مطابق ایسے نمایاں خاندانوں کی فہرست میں بنو ہاشم، بنومطلب، بنوعبدشمس بن عبدمناف، بنواُمیہ، بنوتیم، بنواسد بن عبدالعزیٰ، بنوعبدالعزیٰ بن قصی، بنوزہرہ، بنوعدی، بنوعامر بن لوی، بنوفہر بن مالک، بنوعبدقصی وغیرہ مع حلفاء نیز غیر قریش میں سے بھی ابتدائی مکی دور میں مسلمان ہونے والے حضرت مجن بن الادرع

الاسلمی اور حضرت مسعود بن ربیعہ بن عمرو شامل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی مکی دور میں ہی اشاعتِ اسلام صرف چند خاندانوں تک محدود نہیں رہی اور نہ ان کی تعداد اتنی تھی کہ جنہیں اُنگلیوں پر گنا جاسکے۔ مولانا شبلیؒ نے قریش کے تحمل کے اسباب کے تحت لکھا ہے کہ ''بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہیں تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں۔ اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اُس کا مجرم نہ تھا بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال ممکن نہ تھا''۔ (۶۱)

۳۔ مولانا شبلیؒ نے قبائلی رقابت دکھانے میں دو خاندانوں بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کو (خلافِ حقیقت باہم دگر حریف و مقابل دکھایا ہے جبکہ حسب و نسب، رشتہ و خاندان کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے۔ بنو ہاشم، بنو عبد شمس (بنو اُمیہ)، بنو المطلب اور بنو نوفل، چاروں کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا۔ بقول ایک مصنف چاروں برادر خاندانوں میں اگرچہ اپنے اندرونی اختلافات بھی تھے۔ لیکن یہ اختلافات اُن کے اتحادات سے کہیں کم تھے۔ وہ تمام اجتماعی معاملات میں اور قریشِ مکہ کے دوسرے بطون یا قبائلِ عرب سے تعلقات کے ضمن میں بطور ایک سماجی اکائی کے کام کرتے تھے اور یہ چاروں خاندان ایک دوسرے کے دوست، حلیف اور بھائی تھے نہ کہ رقیب، حریف اور مدمقابل۔ (۶۲) اگر سبقتِ ایمان و اسلام اور شدتِ مخالفتِ اسلام کے لحاظ سے بنو ہاشم اور بنو امیہ کا عمومی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں کا رویہ کم و بیش یکساں تھا۔ چنانچہ مثلاً بنو ہاشم (جہاں سے آفتابِ رسالت اور ماہِ نبوت طلوع ہوا) کے یہاں خاندانِ رسالت کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، اُن کی زوجہ محترمہ اسماء بنتِ عمیسؓ، صفیہ بنتِ عبدالمطلبؓ، ارویٰؓ بنتِ عبدالمطلب، حضرت حمزہؓ اور اُن کے موالی ابو مرثد، اور مرثد غنوی وغیرہ سبقتِ اسلام میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جبکہ بنو عبد شمس بنو امیہ کے خاندانوں میں متعدد خواتین و حضرات قدیم الاسلام ہیں، مثلاً حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص، عمروؓ بن سعید بن العاص، حضرت عثمانؓ، ارویٰؓ بنتِ کرمز، رملہؓ بنتِ شیبہ بن ربیعہ، ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ، اُن کی زوجہ سہلہؓ بنتِ سہیل عامری، سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ، حضرت اُم حبیبہؓ، اُموی حلیف حضرت معیقبؓ بن ابی فاطمہ دوسی اور دیگر حلفاء بنو غنم (بڑی تعداد) وغیرہ وغیرہ نے بھی دامنِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ مولانا شبلیؒ نے بنو اُمیہ کے دو مخالفینِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک ابوسفیان (۶۳) بن حرب جنہوں نے بقول اُن کے بدر کے بعد تمام لڑائیاں برپا کیں۔ لیکن قبل ہجرت پورے مکی دور میں ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کی نشان دہی نہیں فرمائی۔ دوسرے عقبہ بن معیط جو سب سے زیادہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوشِ مبارک پر اُونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اُموی تھا۔ (۶۴) لیکن دوسری طرف بنو ہاشم میں بھی ان کے ہم پلہ بلکہ بڑھ کر دشمن موجود تھے۔ ابولہب کا ذکر پہلے ہو چکا جس سے بڑھ کر کوئی دشمنِ خدا اور رسول زمانے بھر میں نہیں تھا، جو اول دن سے لے کر مکی دور کے آخر آخر تک دشمنی کرتا رہا۔ اور دوسرے ابوسفیان بن حارث ہاشمی، اپنے وقت کا اچھا شاعر، مسلسل بیس برس تک اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہجو کرتا رہا (۶۵) اب انجام کی بھی یہ مماثلت ملاحظہ ہو کہ بنو ہاشم کا ابولہب یہاں دنیا میں ہی عبرت ناک موت سے دوچار ہوا اور بنو اُمیہ کا عقبہ بن ابی معیط، جنگِ بدر کے موقع پر قتل کیا گیا، ابوسفیان اُموی ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر ایمان سے مشرف ہوا، اور ابوسفیان ہاشمی بھی اُسی وقت ایمان لایا۔

۴۔ بنو مخزوم جس کو بجا طور پر مولانا شبلیؒ نے بنو ہاشم کا حریف و مقابل قرار دیا ہے، اور ابوجہل کی اخنس بن شریق سے گفتگو بطور رشوت نقل کی ہے۔ ابوجہل مخزومی اسلام کا بہت بڑا دشمن اور عملی طور پر اسلام دشمن تحریک کا محرک و قائد تھا۔ اس کی دشمنی کی اصل وجہ اُس نے اخنس سے گفتگو میں خود واضح کر دی کہ ایسا رویہ رشک و حسد کے سبب اختیار کیا تھا۔ ابوجہل کے بارے میں بہت کچھ تفصیل گزشتہ فصول میں گزر چکی۔ تاہم یہ قابل ذکر ہے کہ اُس مخزومی خاندان میں ابوجہل جیسے بڑے دشمن کی موجودگی کے باوجود آغازِ دعوتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی اُس کے دل میں بغض و حسد کی آگ بھڑکانے کے عوامل پیدا ہوتے چلے گئے اور وہ اپنے غم و غصے پر قابو نہ پا سکا کیونکہ اُس کے اپنے سگوں اور سوتیلوں نے یکے بعد دیگرے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور پھر دن بہ دن اہل ایمان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نیز کوشش کے باوجود اپنے گھر میں اسلام کے ریلے کو آنے سے نہ روک سکا۔ چنانچہ اس کا حقیقی بھائی سلمہؓ بن ہشام، ماں جایا بھائی عیاشؓ بن ربیعہ مع زوج (اسماء بنت سلامہؓ) عم زادوں میں حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد، اُن کی اہلیہ اُم سلمہ، فرزند سلمہ، ارقم بن ابی ارقم جنہوں نے پوری بے خوفی اور بہادری کے ساتھ صفا کے دامن میں واقع اپنا گھر دارِ ارقم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کر دیا اور اسے اسلام کا مرکز بنا دیا لیکن ابوجہل کو یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ ارقم پر ہاتھ ڈالتا یا اُس مرکز کو بند کرا دیتا وغیرہ ایمان لے آئے اور اس کے حلفا و موالی نے بھی دولتِ اسلام سمیٹ لی، ان میں حضرت عمارؓ، ان کے والد یاسرؓ، ان کی والدہ سمیہؓ، بھائی عبداللہؓ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بنو مخزوم میں اہل ایمان کی ان کے خواتین و حضرات کے علاوہ بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ (۶۶)

غرض اُوپر کی تفصیلات سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی دشمنی و مخالفت

کا اصل محرک قبائلی رقابت وعصبیت نہیں تھا بلکہ طمع وحسد، بغض وعناد، مفادات اور دیگر ذاتی وجوہ کا حصہ زیادہ تھا، مثلاً ابولہب اور ابوجہل دونوں اسلام کے شدید دشمن مگر طرفہ تماشا چشم فلک نے یہ دیکھا کہ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی ایمان لے آتے ہیں تو ان کی حفاظت وحمایت کا اعلان ابولہب ہاشمی کرتا ہے کیونکہ ابوسلمہ ابوجہل کے عم زاد مگر خود ابولہب کے بھانجے (بہن کے فرزند) تھے جن کے لئے وہ سینہ سپر ہوگیا مگر اپنے سگے بھتیجے یعنی محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان کا دشمن تھا۔ (۶۷) اور ادھر جب توفیقِ ایزدی سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مرادِ رسول بن کر اسلام قبول کیا جبکہ وہ خود اس کے بہت بڑے دشمن تھے تو اسلام کے ایک اور بڑے دشمن عاص بن وائل السہمی نے حضرت عمرؓ کی خواہش و طلب کے بغیر ان کو اپنی جوار اور پناہ میں لینے کا اعلان کر دیا۔ (۶۸) یہ بھی واضح ہوگیا کہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ بقول مولانا شبلیؒ "دو نہایت ممتاز قبیلے" تو تھے مگر باہم دگر حریف نہیں، حلیف تھے۔ نیز بنو اُمیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بنو ہاشم کی فتح خیال نہیں کرتا تھا۔ البتہ یہ جذبہ بنو مخزوم میں موجود تھا۔

علاوہ ازیں اگر بالفرض محال قبائلی رقابت وعصبیت کو ہی کارفرما سمجھا جائے تو پھر وہ بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کے مابین ہی کیوں محدود ہو؟ تمام قبائل قریش سے ہی دشمنی کی وجہ قرار پائے گی۔ مگر تمام قبائل میں اہل ایمان کی (دشمنوں سے بڑھ کر) تعداد کی موجودگی کا کیا جواز ہوگا؟

۸۔ عداوت ومخالفتِ قریش کی قرآنی وجوہ

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ قریش اور مشرکینِ مکہ کی عداوت ومخالفت اور دعوتِ نبوی ﷺ کی راہ میں روڑے اٹکانے کے مختلف اخلاقی، سماجی، قومی، عملی، نفسی، نفسیاتی وجوہ تھے۔ جن کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کبر وغرور، تکبر، بڑائی کی ہوس۔ (۶۹) اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّاهُمْ بِبَالِغِيْهِ (۷۰)، لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○ (۷۱)، سرکشی وتکبر (۷۲) قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۷۳)، کبر وغرور کی ایک وجہ مال ودولت کی افراط، کنبے، اولاد کا پھیلاؤ، دنیا کی محبت، وسائل وآسائش کی تمنا ہے (۷۴) نشۂ دولت میں چُور (۷۵) طلبِ دنیا اور ہوس، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (۷۶) یہاں تک کہ خواہش ہی اُن کی معبود بن جاتی ہے مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (۷۷)

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غریبوں کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ (۷۸) مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے ہیں

انہیں حقیر سمجھتے ہیں۔(۷۹) رسول ﷺ کا مذاق اُڑاتے ہیں۔(۸۰) اور ازراہِ تمسخر کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔(۸۱) اس کے لائے ہوئے پیغام اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں۔(۸۲)

۲۔ باپ دادا کی اندھی تقلید پر اصرار۔(۸۳)

۳۔ بغض وعناد سینوں میں۔(۸۴)

۴۔ ضد، ہٹ دھرمی، بے عزتی۔(۸۵)

۵۔ دوغلا پن: خود قرآن سنتے ہیں، دوسروں کو روکتے ہیں۔(۸۶)

۶۔ نادانی ولاعلمی، جہالت: مالهم به من علم (۸۷)

۷۔ تجاہل عارفانہ: ذالک مبلغهم من العلم (۸۸)۔ فلا تنر کوا انفسکم (۸۹)

۸۔ کٹ حجتی۔ جھگڑالو پن۔(۹۰)

۹۔ ناشکرا پن۔ نعمت رسول ﷺ پر: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (۹۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۹۲)

۱۰۔ عذر لنگ: وہی شریعت کیوں جو دوسروں پر اُتری۔(۹۳) قرآن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نازل ہوا؟ مکہ وطائف کے کسی بڑے آدمی، رئیس، سردار پر نازل ہوتا۔(۹۴)

ناجائز مطالبات۔ طلبِ معجزات۔ دوسرا قرآن لاؤ (۹۵) زمین پھاڑ کر ایک چشمہ جاری کردو (تفجر لنا من الارض ينبوعا) کھجوروں اور انگوروں کا باغ آراستہ کردو۔ (جنة من نخيل و عنب) نہریں نکال دو (فتفجر الانهار) آسمان ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اُوپر گرادو (تسقط السماء) اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے رُودررُو لے آؤ۔ (تاتى بالله والملائكة) اپنے لئے سونے کا ایک گھر بنوالو (اويكون لک بيت من زخرف) آسمان پر چڑھ جاؤ، مگر وہ بھی نہیں مانیں گے جب تک کہ وہاں سے ایک کتاب لے آؤ جسے ہم خود پڑھ لیں۔ (ترقىٰ فى السماء ولن نومن لرقيک حتى تنزل علينا كتاباً نقرؤه) (۹۶) اللہ کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اُتریں (۹۷) ہم میں سے ہر ایک کے پاس کھلے خط بھیجے جائیں۔ كل امرى منهم ان يوتىٰ صحفاً منشره (۹۸) نبی پر ساتھ میں فرشتہ بھی کیوں نہ اُتارا گیا۔(۹۹)

اُلٹے الزامات: اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں: يقولون افتر على الله كذبا (۱۰۰)، جھوٹے ہیں۔(۱۰۱) ساحر (۱۰۲)، کاہن ومجنون (۱۰۲) شاعر۔ گستاخی وبے باکی۔ مفتون (۱۰۳) حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کو بت پرستی کی اُلٹی دعوت۔ (۱۰۴)

تکلیف دہ گفتگو۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ○ (۱۰۵) فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ (۱۰۶)

۱۱۔ امرا، رؤسا، معاشرۂ جاہلیہ کے قائدین کا ذاتی کردار۔ فواحش کے عادی (۱۰۷)

نمائندہ کردار (ولید بن المغیرہ/ اسود بن یغوث/ اخنس بن شریق) جھوٹا (فلاتطع المکذبین) (۱۰۸) بڑا (جھوٹی) قسمیں کھانے والا (حلاف مهین) (۱۰۹) ذلیل (مھین) بہت طعنے دینے والا (۱۱۰) ادھر کی اُدھر لگانے والا (لگائی بجھائی) خیر و بھلائی (کے ہر کام) سے بہت روکنے والا (مناع للخیر) (۱۱۱) معتد۔ حد سے بڑھا ہوا (۱۱۲) اثیم۔ گناہ گار (ناجائز کاموں کا عادی) عتل درشت خو (۱۱۳) بے اصل، بے ننگ و نام۔ (زنیم) (۱۱۴) ۱۱۔ مال و دولت، اولاد کی بہتات۔ (۱۱۵) وسیع مال و منال (۱۱۶) بدگو، قرآن کو قصہ کہانی قرار دینے والا۔ (۱۱۷) بدلحاظ (۱۱۸) طلب و تمنائے مزید، طمع و لالچ (ثم یطمع ان ازید) (۱۱۹) آیات و پیغامِ الٰہی سے بغض و عناد (۱۲۰) مغرور متکبر۔ سیدھے منہ بات نہ کرے، تیوری چڑھائے، نازیبا باتیں سوچے، کچھ کر گزرنے کی ٹھان لے، حق ٹھکرائے۔ (۱۲۱)

ذمائم قریش (۱۲۲) شرک۔ نافرمانی والدین۔ غربا و مساکین، یتیموں کے مال، حق پر قبضہ۔ بخل۔ اسراف و تبذیر۔ قتلِ اولاد۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا۔ زنا۔ قتلِ ناحق۔ وعدہ خلافی۔ ناپ تول میں کمی۔ مغرورانہ چال وغیرہ وغیرہ۔

۹۔ قریش اور عیسائیت

مولانا شبلی علیہ الرحمۃ نے اسبابِ مخالفتِ قریش کی تفصیل میں تیسرا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ''قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہۃ الاشرم (بادشاہِ حبش جو کعبے کے ڈھانے کو آیا تھا) عیسائی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلے میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے۔ چنانچہ یہ آیت اُتری:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ

الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ (۱۲۳)

قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہوگئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آجائیں گے۔ خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی، اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔

پھر آگے لکھا ہے کہ اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس زمانے میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا۔ ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں''۔ (۱۲۴)

مخالفتِ قریش کے حوالے سے مولانا شبلیؒ کا بیان کردہ یہ سبب اپنے موضوع، مواد، اور اطلاق کے اعتبار سے محلِ نظر ہے۔ اور بعض نکات کا منطقی ربط تلاش کرنا مشکل ہے۔ مثلاً، مولانا شبلیؒ کا یہ فرمانا کہ ''قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی'' اور یہ توجیہ کہ ابرہہ عیسائی تھا جو کعبہ ڈھانے آیا تھا۔ اس سے ایک طرف تو یہ ترشح ہوتا ہے کہ عیسائیوں سے قریش کی نفرت ابرہہ کے واقعے سے شروع ہوئی۔ دوسری طرف ابرہہ، اُس کے لشکر اور حملے نے اہلِ مکہ کا کیا بگاڑ لیا؟ ابرہہ کے پاس جناب عبدالمطلب کا جانا اور اپنے پکڑے گئے اُونٹوں کی رہائی کا مطالبہ کرنا مشہور واقعہ ہے۔ جبکہ آں جناب نے ابرہہ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ خانۂ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا۔ (۱۲۵) البتہ احتیاطاً اہلِ مکہ اپنے اہل وعیال کو لے کر پہاڑوں پر چلے گئے تھے تاکہ ابرہہ کے بے لگام لشکر سے اُنہیں نقصان نہ پہنچے۔ چونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ ابرہہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے جناب عبدالمطلب قریش کے سرداروں کے ساتھ حرمِ کعبہ میں آئے اور بیت اللہ کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اُنہوں نے دربارِ الٰہی میں مناجات کی کہ اے اللہ! جس طرح بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ ابن ہشام، اور دوسرے مآخذِ تاریخ وسیر میں اس موقع پر دعاؤں کے الفاظ اور عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں، اُن میں ایک اللہ سے ہی استعانت طلب کی گئی ہے۔ (۱۲۶) اُس وقت نہ اُنہوں نے بتوں کا نام لیا نہ ہبل کی جے پکاری، حالانکہ وہاں اُن کے بتوں اور معبودانِ باطل کی بہت بڑی تعداد ہر سمت موجود تھی۔ اور پھر یہ امرِ واقعہ سب کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا کہ اللہ نے اپنے گھر کی واقعی حفاظت فرمائی۔ اصحابِ فیل کے ارادے خاک میں مل گئے اور ابرہہ اپنے لشکر سمیت ناکام ونامراد ٹھہرا۔ یہ واقعہ قریش کو یہ سبق دے گیا کہ خانۂ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ ہی اس کی حفاظت کر کے اپنے دشمنوں کو نیست ونابود کر سکتا

ہے۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہلِ عرب اسے عام الفیل قرار دیتے ہیں۔ مشہور روایات کے مطابق واقعۂ فیل کے پچاس دن بعد حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ (۱۲۷)

مولانا شبلیؒ نے قرآن کی سورۃ الروم کی ابتدائی چار آیات کا جو حوالہ دیا ہے۔ اُس کا ایک خاص تاریخی پس منظر ہے۔ مولانا مودودیؒ کے مطابق آیت غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ کے سبب اُس کا زمانۂ نزول قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اُس زمانے میں عرب سے متصل رومی مقبوضات اُردن، شام اور فلسطین تھے اور ان علاقوں میں رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ عیسوی میں مکمل ہوا تھا۔ یہ سورت اُسی سال نازل ہوئی اور یہ وہی سال تھا جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔ (۱۲۸) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک مخالفتِ قریش اور اہلِ ایمان پر اُن کے مظالم میں کافی شدت آ چکی تھی، یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے (بہت تھوڑے عرصے میں) مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ جا چکی تھی۔ (اس لئے رومیوں کی شکست اور ایرانیوں کی فتح کی خبر جب اہلِ مکہ کو پہنچی تو (اس سے مخالفتِ قریش کا سبب پیدا نہیں ہوا مگر ہاں) قریش کو بغلیں بجانے کا موقع مل گیا۔ بدتمیزی تو پہلے ہی کر رہے تھے اب طعنہ زنی کا موقع ہاتھ آیا اور مسلمانوں کو چھیڑنے میں مزہ آنے لگا۔ خود مکہ معظمہ میں حق و باطل کی آویزش جاری تھی جس میں قریشی مشرکوں، بت پرستوں کا پلّہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ اب ایرانی مجوسی آتش پرستوں کے غلبے اور فتح کی خبروں سے قریش کو زیادہ بے باک ہونے کا موقع مل گیا، چنانچہ بعض مشرکین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے، کل ہم بھی تمہیں اسی طرح مٹا ڈالیں گے''۔ (۱۲۹) اس کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلسلۂ اسبابِ ظاہری کے برخلاف مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وحی کا اعلان کر دیا کہ ''بے شک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں لیکن ۹ سال کے اندر اندر وہ پھر غالب و منصور ہوں گے''۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس کا اتنا غالب یقین تھا کہ اُنہوں نے قریشی سردار ابی بن خلف سے سو اُونٹوں کی شرط لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (۱۳۰) اس معاملے میں بھی قریش ذلیل و خوار ہوئے۔ ایک طرف تو وہ اپنی بہترین کوششوں کے باوجود مہاجرینِ حبشہ کو واپس نہیں لا سکے اور نجاشی کے سامنے منہ کی کھائی اور دوسری طرف سورۂ روم میں مندرج دونوں خوش خبریوں کا صدق ظاہر ہوا۔ ٹھیک نو سال بعد (۶۱۵ + ۹ = ۶۲۴ عیسوی میں شہنشاہِ روم ہرقل کی فوجوں نے زرتشت کے مقامِ پیدائش ارمیاہ کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ (۱۳۱) اور اسی سال

میں قریش مکہ کے کفار و مشرکین کے خلاف (مدینہ منورہ ہجرت کے بعد) مسلمانوں کو بدر کے مقام پر رمضان ۲ھ/ جون ۶۲۴ء میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔ اور بیک وقت دو خوشیاں نصیب ہوئیں۔

مولانا شبلیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس زمانے میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں''۔

اس عبارت میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں:

۱۔ اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کی ضرورت تھی۔ اگر عیسائیت اور نصرانیت کی مروجہ اصطلاحات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اسلام اور عیسائیت میں بعد المشرقین ہے۔ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے لیکن عیسائیت کی بنیاد تثلیث پر ہے۔ اسلام کی الہامی کتاب قرآن اپنی اصلی حالت میں بلا ترمیم و تنسیخ آج بھی موجود ہے، عیسائیت میں مروجہ چاروں انجیلیں الہامی درجہ نہیں رکھتیں اور قطعیت و اصلیت سے خالی ہیں۔ نیز رہبانیت عیسائیت کا طرۂ امتیاز ہے، مگر اسلام اس کا قائل نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت، تعلیمات، زندگی اور رفع الی السماء کا واقعہ تاریخ کی روشنی سے محروم ہے لیکن پیغمبر اسلام کی پوری زندگی تاریخ کی پوری روشنی میں جلوہ گر ہے۔ ہاں اگر عیسائیت کو اپنی اصطلاحی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ یقیناً بعد کی پیداوار ہے، (۱۳۲) لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کچھ لے کر آئے وہ کیا تھا تو وہ حقیقت میں اُس اسلام کا تسلسل تھا جس کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ اس اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کا مشن ایک تھا۔

علاوہ ازیں اسلام اور عیسائیت کے مابین اشتراک اور اختلاف کے بارے میں واقعاتی شہادت کیا کہتی ہے؟ خود مولانا شبلیؒ نے ہجرتِ حبش سن ۵ نبوی کے تحت واقعات و حالات کو تفصیل سے لکھا ہے قریشِ مکہ نے پہلے تو مہاجرین کا تعاقب کیا لیکن ناکام رہے۔ پھر نجاشی کے پاس سفارت بھیجی کہ ہمارے مجرموں کو نکال دو۔ عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص اس کام کے لئے منتخب ہوئے۔ یہ سفر انجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور اُن کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ نجاشی نے اپنے دربار میں مسلمانوں کو بلا کر یہ پوچھا کہ تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟ پھر حضرت جعفرؓ کی پوری تقریر اور پھر نجاشی کی فرمائش پر سورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت نے نجاشی پر رقت طاری کر دی۔ نجاشی نے

قریشی سفرا کو واپس کر دیا۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں۔ اُن لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے، ناراض ہو جائے گا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ کچھ بھی ہو، ہم کو سچ بولنا چاہئے۔ چنانچہ صاف صاف کہہ دیا کہ ''عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے''۔ اس واقعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قریش یہ پوری طرح سمجھتے تھے کہ اسلام، نصرانیت اور بت پرستی دونوں سے مختلف ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھے۔

۲۔ مسلمانوں پر پنج وقتہ نماز کی فرضیت ہجرتِ مدینہ سے کچھ عرصہ پہلے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کے موقع پر ہوئی۔ واقعۂ معراج ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا یعنی وہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا بارہواں سال تھا۔ اس سے پہلے دو وقت کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ نماز پہلے چھپ کر پڑھی جاتی تھی بعد ازاں حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان جگہ منتخب فرماتے تھے۔ یعنی بیک وقت دونوں قبلے (بیت المقدس کا رخ اور کعبۃ اللہ) سامنے ہوتے۔ اس لئے کفار کے لئے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ آپ ﷺ محض رُخ اور جہتِ قبلہ کے اعتبار سے بیت المقدس کے سامنے ہیں یا بالفعل کعبۃ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس لئے غالباً قریش کے لئے یہ بہت زیادہ اہم نہ تھا کہ آپ ﷺ کس قبلے کی طرف متوجہ ہیں۔ مصادر میں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ کفار و مشرکین سے اس بات پر اختلاف زیرِ بحث آیا ہو۔ ہاں مدینہ منورہ جا کر اس کی اہمیت پوری طرح اُجاگر ہوئی۔

۳۔ اُوپر کی تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام اور اُس زمانے کی عیسائیت میں بہت سی باتیں یقیناً مشترک نہیں تھیں بلکہ مختلف تھیں۔ اور قریش کو اسلام یا عیسائیت یا مسلمان اور عیسائی کی پہچان میں کوئی اشتباہ نہیں تھا۔ نیز ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آتی کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قریش آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ یا اسلام کے پس پردہ عیسائیت کے قیام کا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔

۴۔ اس واقعے کو اصحابِ سیر اور مفسرین (۱۳۰۳) نے اپنی تفسیروں میں سورۂ قصص مکیہ کی آیت ۵۲ اور ۵۵ کی شانِ نزول میں تفصیل سے لکھا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں ملک حبش میں عام ہوئیں تو وہاں سے ۲۰ کے لگ بھگ عیسائیوں کا ایک

وفد مکہ مکرمہ آیا اور خانۂ کعبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ اُس وقت قریش کے لوگ بھی اپنی اپنی چوپالوں میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی آ کر آس پاس کھڑے ہوگئے۔ وفد کے لوگوں نے آنحضور ﷺ سے جو سوالات کئے، آپ نے جواب مرحمت فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اسلام (عیسائیت سے مختلف) کی طرف دعوت دی اور قرآن کا کچھ حصہ اُنہیں سنایا۔ قرآن سن کر اُن عیسائیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اُنہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور ایمان سے مشرف ہوئے۔ جب مجلس ختم ہوئی تو ابوجہل اور اُن کے ساتھیوں نے جاتے جاتے وفد کے لوگوں کو راستے میں گھیر لیا اور سخت سست کہا اور کہنے لگے ''تم لوگ تو بڑے نامراد ہو، تم لوگ تو اپنے ملک سے اس شخص کے تحقیقِ حال کے لئے آئے تھے۔ مگر تم ابھی اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر ہی اپنا دین (عیسوی) چھوڑ بیٹھے اور ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ بے وقوف اور احمق تو ہم نے کبھی نہیں دیکھے۔ اس بات پر اُس وفد کے لوگوں نے جواب دیا: ''سلام علیکم لانجاھلکم لنا مانحن علیه ولکم ما انتم علیه، لم نال انفسنا خیرا (۱۳۴) تم پر سلام۔ ہم تم سے کوئی جھگڑا (جہالت) نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر اس بھلائی (اسلام) سے محروم نہیں رکھ سکتے''۔ یہ وفد حبشہ کے عیسائیوں کا تھا، جو دن کی روشنی میں آیا، اور مکہ مکرمہ میں خانۂ کعبہ کے اُس مرکزی مقام پر آ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، جہاں دوست دشمن سب موجود تھے، قریش کے چھوٹے بڑے بھی اپنی اپنی چوپالوں میں تھے اور وفد سے ملاقات کے وقت ساری کارروائی دیکھتے سنتے رہے۔ تمام فریق موجود تھے، رحمتِ عالم ﷺ، اُن کے جاں نثار اہلِ ایمان، اُن کے مخالفین اور دشمنانِ قریش اور آنے والے وفد کے عیسائی اراکین جنہوں نے اپنا دین (عیسائیت) ترک کیا اور اسلام کا مژدۂ جاں فزا سینے سے لگایا، اور ایسے مطمئن و آسودہ ہوئے کہ مخالفین، معترضین کی کسی بات کو اہمیت نہ دی، نہ اُن کو منہ لگایا اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے سلام علیکم لانبتغی الجاھلین (۱۳۵)

۵۔ ابتدائی مآخذ سیرت کی روشنی میں عہدِ رسالت کی مکہ مکرمہ کی آبادی میں ''عیسائی آبادی'' کے حجم کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ مصدقہ ہے کہ جناب ورقہ بن نوفل (۱۳۶) ایک عیسائی عالم کی حیثیت سے اُس معاشرے کے معزز رکن تھے۔ اور عیسائیت کی بنیاد پر اُنہیں وہاں کسی نفرت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نیز قریشیوں کا اپنے معاشی، تجارتی اور مذہبی و علمی اسفار میں حجاز بلکہ عرب سے باہر بلادِ روم اور دوسرے علاقوں میں جانا اور راہبوں سے ملنا، اُن سے گفتگو، استفسار اور رہنمائی حاصل کرنا معروف بات ہے۔ خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت کم عمری میں اپنے چچا جناب ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کرنا اور ایک عیسائی راہب بحیرا کی خانقاہ میں اُترنا نہ صرف یہ کہ دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے۔ بلکہ خود مولانا شبلیؒ نے اس کا عنوان دیا ہے۔ البتہ بحیرا کی روایت پر کلام کیا ہے۔ (۱۳۷) لیکن بہرحال اس گفتگو سے اتنا تو ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ قریش کو عیسائیوں سے نفرت نہیں تھی (بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رغبت تھی) بنابریں یہ سبب کسی طرح اسلام کی مخالفت اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کا جواز پیدا نہیں کرتا۔

اسناد وحواشی

۱۔ التوبہ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹

۲۔ کلمۂ اسلام، پہلا کلمہ نمائندۂ دین اور دیگر تمام کلموں کی اساس ہے۔ کلمہ: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے سچے رسول ہیں)۔ دو حقائق پر مشتمل ہے۔ ایک ہر قسم کے معبود و مسجود کی نفی و بطلان اور بالمقابل صرف ایک اللہ کا اثبات و اقرار۔ اور دوسرے اقرار و اثباتِ رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک ہی جملے یا کلمے میں اثبات و نفی اور الوہیت و عبدیت میں توازن، رسالتِ محمدی ﷺ کے امتیازات میں داخل ہے۔ کیونکہ عقل و خرد کے لئے ان کا ادراک ممکن نہیں اور الہام، حواس، نظر سب دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس بنیادی کلمۂ ایمان و اسلام کی شرح دوسرا کلمہ (شہادت) کرتا ہے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ، جبکہ تیسرا اور چوتھا کلمہ تمجید: سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ولاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم، اور توحید: لاالٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ، لہٗ الملک ولہٗ الحمد یحیی ویمیت وھوحتی لایموت ابداً ابداذوالجلال والاکرام بیدہٖ الخیروھو علیٰ کل شئی قدیر، اول الذکر کے حدود و قیود کا تعین کر کے گویا سنگِ میل نصب کر دیتا ہے تاکہ آدمی کو ایمان لاکر، اسلام قبول کر کے جس شاہراہِ حیات پر طبعی و جسمانی اور عملی طور پر چلنا ہے اس مرحلے سے پہلے (کلمۂ پنجم، استغفار کے ذریعے) ذہنی پیش قدمی کی راہ مستحکم ہوجائے کہ سالک پھونک پھونک کر قدم رکھے اور آگے بڑھے تو ہر قسم کے پندار و آزار سے آزاد، فخر و غرور سے مجتنب اور آذار گی فکر و نظر سے بچ کر اللہ کی جانب بڑھنے کو ہی مقصود و منتہا بنالے، ہرحال میں اُسی کی طرف رجوع ہو اور دانستہ یا نادانستہ معمولی سی لغزش پر بھی اُسی کی طرف پلٹے اور توبہ و انابت سے پھر راہ یاب ہوجائے۔ کلمۂ پنجم کے اقرار میں الفاظ اور انداز پہلے چار کلموں کی بہ نسبت صیغۂ غائب سے حاضر و متکلم میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یعنی استغفر اللہ ربی من کل ذنب اذنبتہٗ عمداً او خطأً سراً او علانیۃً وّاتوب الیہ من الذنب الذی اعلم ومن الذنب الذی لااعلم انک انت العلام الغیوب و ستار الغیوب و غفار الذنوب ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، یہ اقرار اور جہتِ عمل حاملِ ایمان کے اندر ہمت و جرأت اور عزم و حوصلہ پیدا کر کے اسے ردِ کفر کے صاف صاف اعلان پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اور آدمی توحیدِ خالص کی جزئیات و کلیات سے آشنا ہو کر

اللہ سے براہِ راست تعلق کی منزل پر آجاتا ہے اور صیغۂ حاضر متکلم میں یہ استدعا کرتا ہے کہ: اللّٰھم انی اعوذبک من ان اشرک بک شیئاً و انا اعلم به و استغفرک لما لا اعلم به تبت عنه وتبرات من الکفر والشرک والکذب والغیبة والبدعة والنمیمة والفواحش والبهتان والمعاصی کلها و اسلمت واقول لا اله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه اس طرح پہلے کلمے سے شروع ہونے والا دائرہ جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے وہ آخری چھٹے کلمے میں اُن ہی الفاظ پر مکمل ہو جاتا ہے یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

قرآن و حدیث میں توحید پر ایمان کے علاوہ جن دوسری باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اُن میں ملائکہ پر ایمان، کتابوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے پر ایمان شامل ہے، اور یہی ایمانِ مفصل کا مضمون ہے۔ آمنت باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الأخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت، عقائد و ایمانیات کے اس مجموعے میں شامل تمام اجزا لازمۂ ایمان و اسلام ہیں اور ان کا لزوم زندگی بھر قائم رہنا ضروری ہے۔ سورۂ نساء میں حکم ہے: یا ایھا الذین اٰمنوا، اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ والکتٰب الذی نزل علیٰ رسولہ والکتٰب الذی انزل من قبل ومن یکفر باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الأخر فقد ضل ضلٰلاً بعیدا (نساء:۱۳۶) ان ایمانیات ولوازمات میں صاحبِ شریعت رسول اور اہل ایمان برابر ہیں (بقرۃ: ۲۸۵) تقدیر پر ایمان بھی ان ہی ایمانیات کا جزو ہے (النساء: ۷۸، القمر: ۴۹، الطلاق: ۳، الاعلیٰ: ۳ وغیرہ)۔ ''حدیثِ جبریل'' جو بہت مشہور، عظیم الشان اور تمام احادیث کا خلاصہ ہے اور جسے صحیح مسلم میں کتاب الایمان کے تحت پورا نقل کیا گیا ہے اور بخاری میں کتاب الایمان کے تحت باب ۳۷ میں سوالِ جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام کے تحت (حدیث: ۴۸) مختصراً نقل کیا ہے۔ ایمان کے مجموعے میں اللہ پر ایمان اور اُس کے ملائکہ پر اور اُس کے رسولوں پر، اور آخرت پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان شامل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایمانیات کا کل دائرہ لا الٰہ الا اللہ پر موقوف ہے یعنی ایک کلمہ پر، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ ہیں، ملائکہ پر اس لئے کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں، کتابوں پر اس لئے کہ اللہ کی نازل کردہ ہیں، اور اچھی بری تقدیر پر اس لئے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے دین کا خلاصہ ایک کلمہ ہی ہے۔

۳۔ مسند احمد اور بیہقی میں ربیعہ بن عباد الدیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا، وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ ﷺ کہہ رہے تھے ''لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ ''یہ جھوٹا ہے، دین آبائی سے پھر گیا ہے'' میں نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ ترمذی میں طارق بن عبداللہ المحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ ''لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو فلاح پاؤ گے'' دیکھئے: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تفہیم الاحادیث۔ ادارۂ معارف اسلامی، لاہور۔ ۲۰۰۳ء ج ۲، ص ۸۰

۴۔اُمۃ: الدین والملۃ: (وکذلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الاقال مترفوھا انا وجدنا آباء نا علی اُمۃ وانا علی آثارھم مقتدون (الزخرف:۲۲) سعدی ابوحبیب، القاموس الفقہی، لغۃً و اصطلاحاً۔ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراتشی، پاکستان۔(ت ط ن)۔

۵۔المائدہ:۱۰۴

۶۔ایضاً

۷۔البقرۃ:۱۷۰،لقمان:۲۱

۸۔الزخرف:۲۳

۹۔الزخرف:۲۲

۱۰۔الانبیاء:۵۳

۱۱۔الانعام:۱۴۸

۱۲۔ایضاً

۱۳۔علامہ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں سورۂ ص کی آیات ۵،۶ کے ضمن میں سردارانِ قریش (ابوجہل، عاص بن وائل، اسود بن المطلب اور الاسود بن عبد یغوث وغیرہ) کا شکایت کے لئے جناب ابوطالب کے پاس جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شکوہ شکایت کرنا اور حضور ﷺ کا اُن کے سامنے ایک کلمہ پیش فرمانا اور ان لوگوں کا ناراض ہوکر چلا جانا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔(ابن کثیر/تفسیر القرآن، بیروت ۱۹۶۴ء، ج ۶، ص ۴۶، ۴۸)

۱۴۔ایضاً۔نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مودودی/مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم الاحادیث، ادارہ معارفِ اسلامی، لاہور۔۲۰۰۳ء، ج ۱، ص ۱۲۸ تا ۱۳۶۔

۱۵۔مولانا شبلی نعمانیؒ/سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۱۳۔(لاہور ایڈیشن)

۱۶۔ایضاً

۱۷۔ایضاً

۱۸۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ/سیرت سرورِ عالم ﷺ/ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔۱۹۷۹ء ج ۲، ص ۲۲۵

۱۹۔شبلیؒ/سیرۃ، ج ۱، ص ۲۱۱ تا ۲۱۳

۲۰۔سورۃ الحج: آیات ۲۶ تا ۲۹

۲۱۔شبلیؒ/سیرۃ، ج ۱، ص ۲۱۱

۲۲۔تفصیل کے لئے دیکھئے۔ایضاً ص ۲۱۲

۲۳۔سورۂ ص:۵

۲۴۔القصص:۵۷

۲۵۔ قصص: ۵۸

۲۶۔ قصص: ۵۹

۲۷۔ قصص: ۶۰۔ سورۂ قصص کی ان آیات کی تفسیر کے لئے ملاحظہ ہو: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی/تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی، ج ۳، ص ۶۵۰۔ سیرت سرورِ عالم ﷺ، ص ۲۲۷

۲۸۔ شبلیؒ/سیرۃ، ج ۱، ص ۱۷۔۲۱۶

۲۹۔ ایضاً۔ ص ۲۱۷

۳۰۔ مفہوم آیات ۹، ۱۸

۳۱۔ آیات ۱۱، ۲۶

۳۲۔ آیات ۸، ۱۵

۳۳۔ مکی معاشرے میں پائی جانے والی برائیاں جن کی قرآن میں مذمت کی گئی، مکی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں نمایاں طور پر موجود ہیں، مثلاً ان سورتوں میں بھی جن کا حوالہ دیا گیا یعنی سورۃ العلق: ۹، ۱۸۔ سورۃ المدثر: ۱۱، ۲۶ اور سورۃ القلم: ۸، ۱۵ کے علاوہ مثلاً الفجر: ۱۵، ۲۰۔ المطففین: ۱، ۶۔ الحاقۃ: ۳۳، ۳۷۔ البلد: ۶، ۷۔ التکاثر: ۱، ۳۔ الہمزہ: ۱، ۳ اور الماعون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جبکہ اخلاقی خوبیوں، صفات و کمالات اور اوصاف کی نشان دہی، حکم اور ترغیب بھی نمایاں طور پر مکی سورتوں کا خاصہ ہے۔ مثلاً الانعام: ۱۵۱، ۱۵۲، الاسراء: ۲۳، ۳۹۔ النحل: ۹۰۔ الفرقان: ۶۳، ۷۴۔ الشوریٰ: ۲۶، ۴۳۔ المعارج: ۱۹، ۳۴ اور الدھر: ۷، ۸ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ برائیوں، بھلائیوں کی یہ تکرار مدنی سورتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً الرحمٰن: ۹۔ النساء: ۲۹، ۳۰ وغیرہ۔

۳۴۔ ظاہر ہے کہ عوام الناس یہ خود دیکھ رہے تھے کہ اہلِ ایمان اخلاقِ فاضلہ سے متصف ہیں اور اس بات کا بھی براہِ راست اُن کو تجربہ ہو رہا تھا کہ اخلاقِ رذیلہ کا اظہار صاف طور پر کفار و مشرکین سے ہی ہو رہا ہے۔

۳۵۔ القلم: ۵

۳۶۔ یونس: ۱۶

۳۷۔ ایضاً: ۳۵

۳۸۔ یہ بحث ابتدائی فصول میں گزر چکی ہے کہ ا۔ خفیہ تبلیغ کے ابتدائی تین سالوں میں ہی اہلِ ایمان کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہو چکی تھی اس لئے ابتدائی مکی دور میں اہلِ ایمان کو ''چند'' تک محدود سمجھنا تاریخ کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ ب۔ اسلام قریش الظواہر اور قریش البطاح کے تقریباً تمام گھرانوں میں سرایت کر گیا تھا۔ اسے خانۂ کعبہ کے آس پاس صرف چند گھرانوں میں محصور سمجھنا خلافِ واقعہ ہوگا۔

۳۹۔ مولانا شبلیؒ نے تعذیب المسلمین کے زیرِ عنوان حضرت خباب، حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت سمیہ، حضرت یاسر، حضرت صہیب، حضرت ابوفکیہ اور حضرت لبینہ، حضرت زنیرہ، حضرت نہدیہ اور اُم عبیس رضی اللہ عنہم نیز حضرت عثمان، حضرت ابوذر، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم کے ساتھ

قریش کے سفاکانہ سلوک کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کرسکیں''۔ (سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۸، ۲۲۷)

۴۰۔ مثلاً واقد بن عبداللہ یا خالد بن سعید بن العاص بن اُمیہ اور عثمان بن طلحہ وغیرہ۔

۴۱۔ مثلاً حضرت عثمانؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ۔

۴۲۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے بھائی زید اور چچازاد سعید بن زید یا ابوجہل کے بھائی سلمہ بن ہشام یا عمرو بن العاص کے بھائی ہشام بن عاص۔

۴۳۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی بہن۔

۴۴۔ حضرت بلال حبشیؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہوجاتی تو اُمیہ اُن کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینے پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، اُن سے کہتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ یونہی مرجاؤ گے، لیکن اُس وقت بھی اُن کی زبان سے ''احد'' کا لفظ نکلتا جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالے کیا وہ اُن کو شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن یہ اب بھی وہی رٹ تھی اَحد، اَحد۔ (شبلیؒ/سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۲۶)

۴۵۔ حضرت صہیبؓ رومی کا نام صہیبؓ بن سنان تھا۔ اصل وطن تو کچھ اور تھا لیکن بچپن میں ہی رومی فوجی پکڑ کر لے گئے تھے، اس لئے ان میں ہی پرورش پاکر جوان ہوئے، بنی کلب نے خرید کر مکہ پہنچایا اور ان سے عبداللہ بن جدعان نے لے کر آزاد کردیا۔ حضرت صہیبؓ پہلے رومی تھے جنہوں نے ابتدائی زمانے میں ہی ایمان قبول کرلیا تھا۔ اُنہوں نے راہِ خدا میں گوناگوں مصائب ومظالم برداشت کئے لیکن صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: مولانا شاہ معین الدین ندوی/سیر الصحابہؓ، دینی کتب خانہ لاہور، ج ۲، ص ۳۶۹

۴۶۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جب ایمان لائے تو سن مبارک صرف ۱۹ سال تھا، ان کی والدہ کو اُن کے ایمان کا پتہ چلا تو نہایت کبیدہ خاطر ہوئیں، بات چیت کھانا پینا سب چھوڑ بیٹھیں چونکہ حضرت سعدؓ اپنی ماں کے حد درجہ فرماں بردار اور اطاعت شعار تھے، اس لئے سخت آزمائش کا موقع تھا، لیکن جو دل توحید کا لذت آشنا ہوچکا تھا، وہ پھر کفر وشرک کی طرف کس طرح رجوع کرسکتا تھا، ماں نے مسلسل تین دن تک دانہ پانی اپنے اُوپر حرام رکھا لیکن حضرت سعدؓ جیسے مومن بیٹے کی جبینِ استقلال پر شکن تک نہ پڑی۔ خدائے پاک کو یہ شانِ استقامت کچھ ایسی پسند آئی کہ تمام مسلمانوں کے لئے معصیتِ الٰہی میں والدین کی عدم اطاعت کا ایک قانونِ عام بنادیا گیا۔ ایضاً ص ۳۸)

۴۷۔ قریش، جناب ابوطالب کے پاس متعدد بار (تقریباً ۴ مرتبہ) اپنے وفود لے کر گئے جن میں شامل سرداروں کی تعداد بعض اوقات ۲۵ تک پہنچ جاتی تھی۔ شرکا میں تمام اہم بطونِ قریش کے نمائندے شامل ہوتے تھے۔ یعنی بنی عبدشمس بن عبدمناف، بنی اُمیہ، بنی اسد بن عبدالعزیٰ، بنی مخزوم، بنی سہم وغیرہ اور سربرآوردہ نمائندہ وممتاز رؤسا میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، عبقہ بن ابی معیط، نضر بن الحارث، ابو البختری، اسود بن عبدالمطلب، زمعۃ بن الاسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عبداللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف، عاص بن

وائل اور حجاج سہمی کے بیٹے نبیہ اور منبہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (ملاحظہ ہو: ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۸۴ تا ۳۱۶)

۴۸۔ وفودِ قریش نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات لگائے، اُس کا باقاعدہ تفصیلی اظہار غالباً سب سے پہلے عتبہ بن ربیعہ کی طرف سے اُس وقت ہوا جبکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور اسلام لانے والوں کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے بیٹھے تھے، اس موقع پر عتبہ بن ربیعہ نے سردارانِ قریش سے کہا کہ اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر حضرت محمد ﷺ سے بات کروں اور اُن کے سامنے کچھ تجاویز رکھوں، شاید وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب نے کہا، بالکل ٹھیک ابوالولید ہمارا تم پر پورا اطمینان ہے تم اُن سے جا کر ضرور بات کرو۔ عتبہ اُٹھ کر آنحضور ﷺ کے پاس گیا اور یوں مخاطب ہوا کہ بھتیجے ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، وہ تمہیں خود معلوم ہے، اور نسب میں بھی تم شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی (عیب نکالے) اور ہمارے باپ دادا جو مر چکے ان سب کو تم نے کافر اور گمراہ ٹھہرایا۔ اس کے بعد مزید گفتگو اور ترغیبات ہیں۔ (ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۱۳) بعد میں انہی الزامات کی تکرار کی جاتی رہی البتہ ان کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہوتی رہی۔ لیکن اصلاً یہی چار الزام اسبابِ مخالفتِ قریش کی وضاحت کرتے ہیں۔

۴۹۔ ایضاً۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۰۹۔ فرق جماعتنا، فرقت به جماعتهم: ص ۳۱۳

۵۰۔ مولانا شبلیؒ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام سن ۶ نبوی میں لکھا ہے (ص ۲۲۰) پہلے حضرت حمزہؓ ایمان لائے اور دو چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے (ص ۲۲۱)۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے مختلف روایتوں کو جمع کر دیا ہے لیکن زمانے کا تعین نہیں فرمایا۔ (ج ۳، ص ۵۴۷، ۵۵۰) عام سیرت نگاروں نے نبوت کے پانچویں اور چھٹے سال میں بالترتیب حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا ایمان لانا ذکر کیا ہے، خصوصاً حضرت عمرؓ کا ایمان لانا ہجرتِ حبشہ کے بعد کا واقعہ لکھا ہے۔ لیکن پیر کرم شاہ الازہری نے ضیاء النبی (مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۴ء) جلد دوم میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بہت تفصیل اور تحقیق کے بعد ۲ ہجری میں قرار دیا ہے۔ اور اسے پہلے دور (سب سے پہلے ایمان لانے والے ص ۲۲۳) میں شمار کیا ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہی قابل ترجیح ہے اور حقیقت سے قریب تر۔ جہاں تک جناب ابوطالب کی وفات کا تعلق ہے تو اس پر اتفاق ہے کہ آنجناب کا انتقال عام الحزن میں یعنی نبوت کے دسویں سال ہوا۔ نیز سردارانِ قریش کی آخری ملاقات جناب ابوطالب سے اُن کے مرض الموت میں ہوئی۔ (اس تفصیل کی روشنی میں قریش کی الزام تراشی تقریباً ۸ سال تک قائم رہی)

۵۱۔ الانبیاء: ۹۸

۵۲۔ شبلیؒ/ سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۱۸

۵۳۔ ص: ۲۱۳

۵۴۔ابنِ ہشام/ج۱،ص۳۱۳

۵۴۔وعبت به آلهتم و دینهم،ج۱،ص۳۱۳،وسب آلهتنا،ص۳۰۹،وعاب دیننا ایضاً

۵۵۔آیت:۵۲

۵۶۔شبلیؒ/سیرۃ النبی،ج۱،ص۱۶۔۲۱۵

۵۷۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی/دِنبوی ﷺ میں تنظیم ریاست وحکومت/ نقوش،لاہور۔رسول نمبر،ج۵،ص۳۹۹ومابعد،مطبوعہ۱۹۸۳ء

۵۸۔مودودی/تفہیم الاحادیث ج۱،ص۸۰

۵۹۔مولانا عبدالرؤف داناپوری/اصح السیر/ص۵۹تا۶۹

۶۰۔نقوش لاہور،رسول نمبر۔ج۵،۱۹۸۳ء،۔ص۳۹۸،۵۲۲،بعنوان قبائلِ عرب اور اسلام

۶۱۔مولانا شبلی/سیرت النبی،ج۱،ص۲۱۸

۶۲۔صدیقی/ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی،نقوش،لاہور۔رسول نمبر،ج۵،ص۴۱۰۔

۶۳۔ابوسفیان بن حرب نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔البتہ ان کی صاحب زادی حضرت اُم حبیبہؓ نے ابتدائی مکی دور میں اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ ۶ نبوی میں ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں۔حبشہ میں جب ان کے شوہر عیسائی ہوگئے تو وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں،اور پھر بالآخر ۷ ہجری میں اُم المؤمنینؓ بن کر مدینے واپس آئیں۔(ایضاً،ص۴۱۷)ابوسفیان بن حرب کے دو فرزندوں حضرت یزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان نے صلحِ حدیبیہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ابوسفیان بن حرب کی زوجہ ہند بن عتبہ ربیعہ نے اپنے فرزندوں کے ساتھ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔(ایضاً)

۶۴۔سیرۃ النبی،ج۱،ص۲۱۶

۶۵۔ایضاً،ص۱۳۔۴۱۲

۶۶۔ایضاً

۶۷۔ایضاً،ص۴۲۳

۶۸۔ایضاً،ص۴۲۶۔''بنو ہاشم اور بنواُمیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر''/ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی کا تفصیلی مضمون،برہان،دہلی،جنوری ۱۹۸۰ء،میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔مزید مطالعے کے لئے اُن کا ایک اور مقالہ ''بنو ہاشم اور بنواُمیہ کے ازدواجی تعلقات''(مطبوعہ برہان،دہلی۔جون ۱۹۸۰ء)ملاحظہ کیجئے۔

۶۹۔انعام:۵۱تا۵۳۔ مدثر:۲۳

۷۰۔المومن:۵۶

۷۱۔فرقان:۲۱

۷۲۔فرقان:۳۱

۷۳۔مومن:۳۵

۷۴۔الکہف:۴۵،۴۶۔النحل:۷۱۔ابراہیم:۳،۴

۷۵۔حجر:۷۲،۸۸۔مریم:۷۷،

۷۶۔النجم:۲۳۔فرقان:۴۳۔

۷۷۔جاثیہ:۲۲۔فرقان:۴۳

۷۸۔انعام:۵۳

۷۹۔ایضاً

۸۰۔الفرقان:۴۱

۸۱۔الفرقان:۷

۸۲۔انعام:۶۸تا۷۳

۸۳۔الزخرف:۲۲،۲۳،۲۴

۸۴۔ہود:۵

۸۵۔حٰمٓ سجدہ:۵

۸۶۔انعام:۳۵،۳۶۔حٰمٓ سجدہ:۲۷۔الانفال:۳۵

۸۷۔النجم:۲۸۔نحل:۴۴

۸۸۔النجم:۲۹،۳۰

۸۹۔النجم:۳۶

۹۰۔النحل:۴

۹۱۔النحل:۸۳

۹۲۔ابراہیم:۸

۹۳۔الشوریٰ:۱۳

۹۴۔الزخرف:۳۱

۹۵۔یونس:۱۵

۹۶۔الاسراء:۹۰تا۹۳۔نیز الانعام:۷تا۹

۹۷۔انعام:۳۷،۳۹۔عنکبوت:۵

۹۸۔مدثر:۵۲،۵۵

۹۹۔انعام:۸،۹

۱۰۰۔شوریٰ:۲۴۔سبا:۸

۱۰۱۔انعام:۳۳

۱۰۲۔طور:۱۵۔مدثر:۲۴۔زخرف:۲۰۔الاحقاف:۷۔ذاریات:۳۹

۱۰۳۔طور:۲۹،۔تکویر:۲۲۔اعراف:۱۸۴۔مومنون:۲۵۔الدخان:۱۴۔قلم۲،۵۔قلم:۶

۱۰۴۔المومن:۶۶۔الحجر:۹۷،

۱۰۵۔الحجر:۹۷

۱۰۶۔الانعام:۶۸

۱۰۷۔اعراف:۳۳۔النجم:۳۲

۱۰۸۔القلم:۸

۱۰۹۔القلم:۱۰

۱۱۰۔القلم:۱۱

۱۱۱۔القلم:۱۲

۱۱۲۔القلم:۱۳

۱۱۳۔القلم:۱۳

۱۱۴۔القلم:۱۳

۱۱۵۔القلم:۱۴۔

۱۱۶۔مدثر:۱۲،۱۳

۱۱۷۔القلم:۱۵

۱۱۸۔الشوریٰ:۲۳

۱۱۹۔مدثر:۱۵

۱۲۰۔مدثر:۱۶

۱۲۱۔المدثر:۱۸تا۲۵

۱۲۲۔الاسراء:۲۲تا۴۴

۱۲۳۔الروم:۱،شبلی/ج۱،ص۲۱۵

۱۲۴۔ایضاً

۱۲۵۔ابرہۃ، جناب عبدالمطلب کی وجیہ وشکیل شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا، اُس نے جب ترجمان کے ذریعے پوچھا کہ کوئی حاجت ہے تو بتائیں۔اس پر عبدالمطلب نے اپنے دوسواُونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور ابرہہ کے اس تعجب پر کہ تمہیں اُونٹوں کی فکر ہے لیکن تمہیں اُس گھر کی کوئی فکر نہیں جسے میں ڈھانے آیا ہوں۔عبدالمطلب نے بڑا منطقی جواب دیا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ان اُونٹوں کا مالک ہوں اس لئے ان کا سوال کیا اور رہا وہ گھر، اُس

کا بھی ایک مالک ہے اسے گرانے کے لئے آنے والوں کو وہ خود روک لے گا۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۵۱

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۱۶۷۔

۱۲۸۔ ملاحظہ: مودودی/ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن ج ۳، ص ۲۴ ۷۔ تفصیلی تاریخی پس منظر اور تاریخی لحاظ سے تفسیر سورۂ روم کے لئے: ایضاً، ص ۲۴ ۷ تا ۴۸ ۷

۱۲۹۔ دیکھئے: تفسیری حاشیہ مولانا شبیر احمد عثمانی بر ترجمہ قرآن شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ مطبوعہ مجمع الملک فہد للطباعۃ المصحف الشریف۔ مدینہ منورہ ۳۹۔ ۵۳۸

۱۳۰۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: ایضاً

۱۳۱۔ مودودی/ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۷ ۷

۱۳۲۔ مسیحیت کا ظہور، سینٹ پال، اُصولِ دین میں تحریفات، پاپائی نظام، عیسائیوں کے بنیادی عقائد میں فساد، عقیدۂ تثلیث، الوہیت مسیح علیہ السلام وغیرہ پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ کیجئے: مودودی/ نصرانیت، قرآن کی روشنی میں۔ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔ ۲۰۰۰ء، ص ۶۷ تا ۸۸۔ نیز ملاحظہ ہو، ضمیمہ ۱، ص ۲۴۵، ۲۵۴

۱۳۳۔ مثلاً ابن ہشام نے اپنی سیرت میں امر وفد النصاریٰ الذین اسلموا کے عنوان سے لکھا ہے اور سورۂ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۵ کا شانِ نزول بتایا ہے۔ البتہ آخر میں لکھا ہے کہ ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ نجران کے عیسائیوں کا وفد تھا''۔ (ج ۲، ص ۳۲) لیکن یہ اس لئے ممکن نہیں ہوسکتا کہ سورۂ قصص کی سورت ہے جس کا نزول سورۂ شعراء اور سورۂ نمل سے متصل ابتدائی مکی زمانے میں ہوا، دیکھئے: تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۶۱۰، دیباچہ سورت۔ جیسا کہ خود قصۂ مذکور کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے۔ جبکہ وفدِ نجران اُن عیسائیوں پر مشتمل تھا جو حبشہ سے نہیں بلکہ یمن سے ۹ ہجری میں مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے پاس آیا تھا۔ اسی طرح مثلاً ابن کثیر نے (اپنی تفسیر میں سورۂ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۵ کے تحت لکھا نیز اپنی کتاب السیرۃ النبویۃ داراحیاء التراث العربی، بیروت میں اسلام عمر بن الخطاب (ص ۴۲) کے بعد بیہقی کے حوالے سے ان الفاظ سے نقل کیا ہے ''ثم قدم علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشرون رجلاً وھو بمکۃ..... من النصاریٰ..... من ارض الحبشۃ..... حول الکعبۃ۔ آخر میں پھر ابن ہشام کی طرح بیان تو کیا ہے مگر ایسے الفاظ میں جن سے اشتباہ واضح ہوجاتا ہے فیقال ان النفر من نصاریٰ نجران، واللہ اعلم ای ذلک کان ایضاً۔ نیز تفسیر ابن کثیر/ مطبوعہ بیروت، ۱۹۶۶ء، ج ۵، ص ۲۸۹۔ حاشیہ عثمانی اُردو (ص ۵۲۱) نیز تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۶۴۵ وغیرہ۔

۱۳۴۔ ابن ہشام/ ج ۲، ص ۳۲

۱۳۵۔ سورۃ القصص: ۵۵

۱۳۶۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں تفصیلی تعارف گزشتہ فصل میں آچکا ہے۔

۱۳۷۔ شبلیؒ/ سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۱۸۲، عنوان ہے: شام کا سفر